AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly *Research Journal* Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

”آثار الصنادید“ کا اداریاتی ارتقا: ابتدائی دو نسخوں میں تاریخی، لسانی اور فنی تبدیلیوں کا تحقیقی جائزہ

The editorial evolution of "Athar al-Sanadid": A research review of historical, linguistic, and technical changes in the first two manuscripts

شمائلہ کاشف

ایم ایس اردو (اسکالر)، سپیریئر یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر کلیم اختر قیصرانی

اسسٹنٹ پروفیسر، سپیریئر یونیورسٹی، لاہور

عیفہ زاہد

ایم ایس اردو (اسکالر)، سپیریئر یونیورسٹی، لاہور

Abstract
Athar Al Sanadeed is the main work of Sir Syed Ahmed Khan on the historical buildings and personalities of Delhi. Its first edition was published in 1847, but then a few years later in 1854, the author republished it with a new arrangement and a new text. As Atar al-Sanadid is the work of Sir Syed's early age, therefore his research and criticism The study also throws considerable light on his formative period and gives an opportunity to see how the writer's thoughts and tendencies changed under the changing circumstances and demands of life.
A few questions are very important regarding Athar Al Sanadid. For example, why did Sir Syed feel the need to bring out a completely changed edition of it just a few years later? Or what is the main reason for the simple and difficult style of writing in the first publication? And in this regard, how far is the commitment of Imam Bakhsh Sahbai's support correct? I have tried to find answers to such questions avoiding personal prejudices. The last two publications of Athar al-Sanadid will be the subject of my assignment.
Keywords: *Research, Old traditions, style statement, Creative presentation, Old works.*

جہاں تک *آثار الصنادید* کی پہلی دو اشاعتوں کا تعلق ہے، یہ محض ایک ہی کتاب کی دو طباعتیں نہیں بلکہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی مصنف کی دو الگ علمی مرتبہ رکھنے والی تصانیف کے طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ اسی سبب سے اس تحقیق میں *آثار الصنادید* کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے دونوں اشاعتوں کو الگ حیثیت کے ساتھ پیش کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ اشاعتِ ثانی علمی اور تحقیقی اعتبار سے اشاعتِ اول پر فوقیت رکھتی ہے۔

مثال کے طور پر، سلطان شمس الدین التمتش کے مقبرے کے حوالے سے، فیروز شاہ تغلق کی *فتوحاتِ فیروز شاہی* سے لیا گیا جملہ اشاعتِ ثانی میں شامل ہے، جبکہ اشاعتِ اول میں یہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح، مولانا جمالی کی مسجد کے سلسلے میں بھی اشاعتِ اول میں سرسید نے یہ لکھا کہ:

"اس مسجد پر کوئی تاریخ یا کتبہ نہیں ہے اور اس عمارت کا تاریخ سے بھی حال نکالنا نہایت مشکل ہے

AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

اس سبب سے میں یقین سے نہیں بتا سکتا کہ یہ مسجد کب بنی اور کس نے بنائی، مگر اس قدر جانتا ہوں کہ یہ درگاہ کے ساتھ ہے اور غالباً اسی زمانے میں بنی ہوگی۔"

یہ بیان نہ صرف تاریخی شواہد کی کمی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اشاعتِ ثانی میں کی جانے والی اصلاحات کی ضرورت اور اہمیت کو بھی واضح کرتا ہے۔ اشاعتِ ثانی میں سرسید نے مآخذ وحوالہ جات کے ساتھ زیادہ مستند معلومات فراہم کیں، جس سے کتاب کی تحقیقی قدر میں اضافہ ہوا اور تاریخی حقائق کی درستگی ممکن ہوئی۔

"فیروز شاہ لکھتا ہے کہ میں نے اس مقبرے کی بھی مرمت کی اور صندل کا چھپر کھٹ چڑھایا اور گنبد میں پتھر کی سیڑھی تراش کر لگائی مگر اب ان چیزوں کا پتہ نہیں رہا"(1)

اسی طرح اشاعت اول میں سرسید نے مولانا جمالی کی تاریخ وفات (۹۴۲ ہجری) کو مدنظر رکھتے ہوئے بغیر کسی حوالے کے لکھ دیا ہے کہ ان کی درگاہ بھی ۹۴۲ ہجری کو ان کی وفات کے بعد بنی۔(۲) لیکن اشاعت ثانی میں انہوں نے اخبار الاخیار کے حوالے سے اپنے پچھلے بیان میں ترمیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ درگاہ دراصل مولانا جلال کا مسکن تھی جو انہوں نے اپنے جیتے جی ۹۳۵ ہجری میں تعمیر کی اور بعد از وفات ۹۴۲ ہجری کو یہاں دفن ہوئے۔(۳) مناسب کتب حوالہ کی عدم دستیابی بھی سرسید کا بڑا مسئلہ ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر چھپ کر تیار ہو گیا۔(۴) اتنے قلیل عرصے میں سرسید کے لئے کتب حوالہ اور مآخذ کو پوری طرح کھنگالنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کوشش کے باوجود اشاعت اول میں تحقیقی نقطہ نگاہ سے خامیاں رہ گئی ہیں۔ مذکورہ بالا درگاہ مولانا جمالی کی مسجد کی تاریخ بنا کے بارے میں سرسید نے اشاعت اول میں اپنی بے بسی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس مسجد پر کوئی تاریخ یا کتبہ بنا نہیں ہے اور اس عمارت کا تاریخ سے بھی حال نکالنا نہایت مشکل ہے۔ اس سبب سے میں یقین سے نہیں بتا سکتا کہ یہ مسجد کب بنی اور کس نے بنائی مگر اس قدر جانتا ہوں کہ درگاہ کے ساتھ کی مسجد ہے اور اسی زمانہ میں بنی ہوگی"(5)

اشاعت ثانی میں سرسید نے اخبار الاخیار کے حوالے سے واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ مسجد بھی مولانا جمالی نے ۹۳۵ ہجری میں اسی درگاہ کے ساتھ بنائی تھی۔(۶) سرسید کی شمولیت (7) آثار الصنادید کا انگریزی ترجمہ کرنے کے ارادے باندھنے والے انگریزوں کے مشوروں (8) اور رسالہ سلسلۃ الملوک کی تصنیف کے سلسلے میں کی گئی سرسید کی ان تھک محنت کا ذکر ناگزیر ہے، وہاں وقت کے عامل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آثار الصنادید کی پہلی دو اشاعتوں کا درمیانی عرصہ آٹھ برس پر محیط ہے۔ سرسید ایسے جلدی جلدی کتابیں لکھنے اور چھپوانے والے مصنف کی زندگی کی یہ ایک حیران کن استثنائی مثال ہے کہ انہوں نے محض اپنی ایک کتاب کی اصلاح پر آٹھ سال لگا دیے۔ غرض اتنے طویل عرصہ کی مسلسل محنت سے موضوع تحقیق کے بہت سے عقدے ان پر وا ہو گئے جن کا بصورت دیگر حل ہونا مشکل تھا۔

کتبات کے ضمن میں بھی اشاعت ثانی کو برتری حاصل ہے۔ اشاعت اول میں محض کتبات کی عبارت نقل کی گئی ہے لیکن اشاعت ثانی میں ان کا مکمل چربہ پیش کیا گیا ہے اور اس ضمن میں اس حد تک احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جو کتبے کندہ ہیں انہیں سیاہ حروف میں اور جو ابھرے ہوئے ہیں انہیں دوہرے حروف میں دکھا کر ان کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ صحت متن کے لحاظ سے بھی اشاعت ثانی کے کتبات بہتر ہیں۔ سی۔ ڈبلیو ٹرول نے مسجد اکبر آبادی سے متعلق دونوں اشاعتوں میں پائے جانے والے ایک کتبے کے حوالے سے لکھا ہے کہ اشاعت ثانی میں اس کتبے کے درست متن کے مقابلے میں اشاعت اول میں پیش کردہ اس کے متن کے اندر چھ اغلاط پائی جاتی ہیں(۱۰)۔ نقشے اشاعت ثانی میں شامل نہیں ہیں۔ حالی نے لکھا ہے کہ سرسید نے اشاعت ثانی کے لئے نقشے تیار تو کرائے مگر وہ چھپنے سے پہلے "غدر" میں تلف ہو گئے (۱۱)۔

خلیق انجم نے اس بنا پر حالی کے بیان کو محل نظر ٹھہرایا ہے کہ دوسرا ایڈیشن تو ۱۸۵۴ء میں چھپ گیا تھا۔ پھر ۱۸۵۷ء میں نقشوں کی تلفی چہ معنی دارد۔ خلیق انجم نے ۱۸۵۴ء میں اشاعت ثانی کے چھپنے کا ذکر کیا ہے چھپنا اور بات ہے اور شائع ہونا اور بات۔ حالی کے اس بیان سے کہ "غدر" میں اشاعت ثانی کے بیشتر نسخے بھی تلف ہو گئے سے اس شبے کو تقویت ملتی ہے کہ ۱۸۵۷ء تک دوسرا ایڈیشن شائع نہ ہو پایا تھا کیونکہ بڑی تعداد میں نسخوں کی تلفی اسی وقت ممکن ہے جب وہ ناشر کے پاس یکجا ہوں اور شائع ہو کر قارئین تک نہ پہنچے ہوں۔

AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

دوسرے اشاعت ثانی ساری کی ساری ۱۸۵۴ء میں چھپی بھی نہیں۔ سرسید نے اس کے مختلف اجزاء مختلف اوقات میں مختلف مطابع سے چھپوائے۔ بقول کی۔ڈبلیو ٹرول اس کے صفحہ اول بھی اردو سرورق پر سال طباعت کے طور پر ۱۲۶۹ ہجری بمطابق ۱۸۵۲ء عیسوی درج ہے اور ساتھ ہی مطبع سلطانی دہلی کا نام بھی لکھا ہے۔ صفحہ دوم یعنی انگریزی سرورق پر ۱۸۵۴ء عیسوی کا سال درج ہے(12) اسی طرح کتاب کے ضمیمے کے شروع میں جو کتبات پر مشتمل ہے یہ عبارت مرقوم ہے۔

"مطبوعہ مطبع احمدی واقع دہلی، اہتمام شیخ ظفر غنی، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء-04"(۱۳)

اشاعت ثانی کے اس انداز طباعت کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس ممکن ہے کہ سرسید اس کے نقشے الگ قسط میں چھپوا کر شامل کتاب کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اشاعت اول میں کتبے عنوانات کے ساتھ تھے لیکن اشاعت ثانی میں انہیں کتاب کے آخر میں یکجا کر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ نقشوں کی شمولیت کی بھی کوئی ایسی ہی صورت سرسید کے ذہن میں ہو اور ان کی شمولیت کے خیال سے ہی انہوں نے ۱۸۵۷ء تک کتاب کے مختلف اجزاء کو ایک جلد میں یکجا کر کے شائع نہ کیا ہو لیکن بعد ازاں تکمیل نقشوں اور کتاب کے متعدد دوسرے اجزاء کی تلفی سے بددل ہو کر انہوں نے باقی ماندہ اجزاء کو ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر کے اشاعت کے لئے پیش کر دیا ہو۔ بقول خلیق انجم پہلا ایڈیشن چھ سو صفحات پر مشتمل تھا جب کہ دوسرا ایڈیشن دو سو چوراسی صفحات کا رہ گیا(14) صفحات میں یہ کمی صرف باب چہارم کے اخراج کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کی ہے کہ سرسید نے کم و بیش ہر عنوان کو نئے سرے سے غیر ضروری باتوں سے پاک کرتے ہوئے مختصر کر کے لکھا ہے۔ اختصار اچھی چیز ہے لیکن متعدد مقامات پر بہت سی ضروری باتیں بھی اس کی زد میں آ گئی ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اشاعت ثانی سے مکمل طور پر اشاعت اول کا صرف باب چہارم خارج کیا گیا۔ حالانکہ اس کے برعکس اشاعت اول کے باب سوم کے متعدد عنوانات مثلاً امام علی منیا میں اور رشیدی خاں فولاد کا بنگلہ وغیرہ بھی اشاعت ثانی میں شامل نہیں کئے گئے۔ اشاعت اول میں مقبرہ غیاث الدین تغلق کو تین صفحوں میں بیان کیا گیا ہے۔(۱۵)

اشاعت ثانی میں یہی عنوان ایک صفحے میں سمو دیا گیا ہے اور اختصار کی خاطر جیومیٹری کی اصطلاحوں میں مقبرے کی عمارت، گنبد کے نفس اور محراب دار دروازوں، قبروں کے تعویذوں، ضلع غربی کے کنوئیں اور فیروز تغلق کے بنائے ہوئے پل کا ذکر حذف کر دیا گیا۔(۱۶) اشاعت ثانی کے اختصار کی ایک وجہ ان پرانی روایات کا اخراج بھی ہے جو معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی تھیں لیکن کتب کے حوالہ کی مناسب سند نہ ملنے کی بنا پر دوسرے ایڈیشن میں شامل نہ کی گئیں۔ مقامات سے قطع نظر اشاعت اول مجموعی طور پر سادہ اور آسان زبان میں ہے۔ اس ضمن میں خواجہ ذکریا لکھتے ہیں:

"دونوں اشاعتوں کے انداز بیان کا مقابلہ کیا جائے تو کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ رنگینی بیان اور فارسیت کی بجائے سلاست سے آراستہ ہے۔ اگرچہ اشاعت ثانی میں مواد کے اعتبار سے قطع و برید کی گئی ہے۔ بعض فقروں میں کمی بیشی کی گئی ہے لیکن جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ اشاعت اول کا صرف آخری باب جو مشاہیر دہلی کے بارے میں ہے کسی قدر مختلف اسلوب میں نظر آتا ہے"(17)

اشاعت اول اختصار اور جامعیت کی صفت سے کسی حد تک عاری نظر آتی ہے۔ اس اشاعت میں زبان ٹھیٹھ اور روزمرہ کی زبان تو ہے لیکن علمی اور کتابی زبان کا درجہ نہیں پا سکی۔ سرسید موقع بے موقع موضوع سے ہٹ کر اظہار جذبات کرنے لگتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا عدم توازن بھی ان کے راستے کی رکاوٹ ہے۔ وہ اپنے مشاہدات کی جزئیات کے سلسلے میں غیر متوازن ہیں۔ بعض باتیں بلاضرورت بیان کر دیتے ہیں اور بعض غیر اہم جزئیات کو خواہ مخواہ طول دینے لگتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اشاعت ثانی کافی حد تک ان عیوب سے پاک ہے اور اس کی زبان معیاری اور کتابی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ اب چند ایسے شواہد پیش کئے جاتے ہیں جن سے مندرجہ بالا بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ قطب مینار کے بارے میں اشاعت اول میں منقول ہے:

"یہ لاٹ اس قدر بلند ہے کہ آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے اوپر سے بے شک آسمان پکڑ لوں گا اور اس نردبان کے ذریعے سے بے شبہ آسمان پر چڑھ جاؤں گا"(۱۸)

AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

یہ جملہ نہ صرف مبالغہ آرائی پر مبنی ہے بلکہ بات کو خواہ مخواہ طول دینے کی کوشش ہے۔ اشاعت ثانی سے یہ جملہ اور اسی طرح کے بہت سے جملے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ قطب مینار پر چڑھے ہوئے لوگ زمین پر سے کیسے نظر آتے ہیں۔ اس بارے میں سر سید اشاعت اول میں لکھتے ہیں:

"ایسا شبہ پڑتا ہے کہ فرشتے آسمان پر سے اترے ہیں"(۱۹)

اشاعت ثانی میں یہی جملہ کچھ یوں ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فرشتے آسمان سے اترے ہیں۔"(۲۰)

موخر الذکر جملے میں نہ صرف حرف "پر" کا غیر ضروری استعمال نہیں بلکہ یہ پہلے جملے کی نسبت سکہ بند کتابی زبان کے زیادہ قریب بھی ہے۔ "ایسا شبہ پڑتا ہے کی نسبت " ایسا معلوم ہوتا ہے" رائج الوقت زبان سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ سکہ بند کتابی زبان کی ایک خصوصیت اس کی عمومیت ہے۔ یہ ایسے عمومی طرز بیان کی حامل ہوتی ہے جس میں امر واقعہ سے تھوڑا بہت انحراف محسوس نہیں ہو پاتا بلکہ عمومیت کے پردے میں چھپا رہتا ہے نیز یہ کتابی انداز بیان حقائق کے لئے مناسب ترین زبان کے چناؤ کے جھمیلے میں پڑنے کے بجائے اپنی سہل پسندی اور غیر شخصی رویے کی بنا پر اظہار کے بنے بنائے سانچوں پر اکتفا کرنے لگتا ہے۔ یوں بسا اوقات حقیقت غلط لفظوں کا شکار ہو کر ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔ اس کی ایک مثال قطب مینار کے بارے میں اشاعت اول سر سید کے دو جملے ہیں۔ سر سید اشاعت اول میں لکھتے ہیں:

"یہ لاٹ اس قدر بلند ہے کہ بہت دور دور کے پھرنے والے بجز ایک آدھ جگہ کے ایسی بلند عمارت روئے زمین پر نشان نہیں دیتے"(۲۱)

یہی بات اشاعت ثانی میں اس پیرائے میں کہی گئی ہے:

"حقیقت میں یہ عمارت ایسی ہے کہ روئے زمین پر اپنی مثال نہیں رکھتی۔"(21)

اگر صرف طرز بیان کے حوالے سے دیکھا جائے تو دوسرا جملہ اپنے اختصار، بندش کی چستی اور رائج الوقت انداز بیان سے قربت کی بناء پر پہلے جملے سے کہیں بہتر محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت میرے خیال میں پہلے جملے میں زیادہ بہتر طور پر سموئی گئی ہے۔ "بہت دور دور کے پھرنے والے" اور "بجز ایک آدھ جگہ کے" کے کلمات مصنف کی احتیاط پسندی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ احتیاط پسندی موخر الذکر جملے کے اس حصے میں کہ "روئے زمین پر اپنی مثال نہیں رکھتی" طرز بیان کے ایک بنے بنائے سانچے پر قربان کر دی گئی ہے۔

غرض اشاعت اول کا اسلوب سادگی کے باوجود شخصی اور کسی قدر غیر معروضی ہے۔ اسلوب کا شخصیت سے براہ راست تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشاعت ثانی کے مقابلے میں جہاں شخصی انداز کم رہ گیا ہے، اشاعت اول میں سر سید کے خاص انداز کی گلکاریاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اگرچہ تکلف نظر آنے کے بجائے خال خال اور کہیں کہیں۔ ذرا مسجد قوت الاسلام کے بارے میں اشاعت اول کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے:

"اس عمارت عالی کا ایک ایک پتھر بڑھیا کے دانتوں کی طرح گرتا جاتا ہے اور جو باقی ہے وہ خل خل ہلتا ہے"(۲۳)

اس طرح کا انداز بیان اشاعت ثانی میں مفقود ہے۔ اشاعت اول میں کوشک انور یا مہندیاں کے بارے میں لکھتے ہوئے سر سید نے ایک ایسے نواب کا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے بار بار غیر ضروری حوالہ دے کر عبارت کو خواہ مخواہ طول دیا ہے لکھتے ہیں:

"مشہور ہے کہ کوئی نواب تھے کہ جناب حضرت غوث پاک کی جناب میں ان کو نہایت اعتقاد تھا اور ہندوستان میں بعضے بعضے لوگوں نے یہ رسم نکالی ہے کہ ہر برس حضرت غوث الاعظم کی مہندیاں بھرا کرتے ہیں۔ یعنی کھپچیوں کی ایک برجی اونچی سی بنا کر اور کاغذ سے اس کو روشنی کرتے ہیں۔ تمہارے نواب صاحب کے ہاں یہی مہندی روشن ہونے کی رسم تھی جبکہ وہ نواب صاحب ہوئے اور اللہ تعالی نے ان کو روپیہ بہت سا دیا۔ انہوں نے اس رسم کے سبب ایک عمارت مہندی کی صورت کی بنا دی اور اس میں روشنی کیا کرتے تھے اور بہت سا کھانا پکا کر للہ خیرات کیا کرتے تھے۔ جب سے اس عمارت کا نام مہندیاں کر کے مشہور ہو گیا مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ نواب صاحب کون تھے جنہوں نے یہ مہندیاں بنائی۔"(۲۴)

AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

اشاعت ثانی میں انہی معلومات کو ذرا جامعیت سے کام لیتے ہوئے اور نواب صاحب کا غیر ضروری ذکر حذف کرتے ہوئے اس سے نصف سے بھی کم سطور میں سمو دیا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہندوستان میں رواج ہو گیا ہے کہ برسویں دن بڑے پیر کی نیاز میں کاغذ کی برجی جس کو مہندی کہتے ہیں بنا کر اس کے چاروں طرف روشنی کرتے ہیں۔ یا تو اس سبب سے کہ اس عمارت کی صورت اس طرح کی ہے اور یا اس سبب سے کہ خاص اس دن کی روشنی کو بنی تھی مہندیاں اس کا نام مشہور ہو گیا۔" (۲۵)

برسوں بعد ان دونوں اشاعتوں کے بارے میں سرسید کی کیا رائے تھی؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ یوں تو انہوں نے کبھی کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا لیکن بعض باتوں سے عندیہ ملتا ہے کہ پسند و ناپسند پھر بدل گئی تھی اور مصور کو نقش ثانی کے مقابلے میں نقش اول بھانے لگا تھا۔ اشاعت اول کی مرثیہ گوئی خاص مقاصد کے تابع تھی۔ بے شک انیسویں صدی کے نصف اول کے ابتدائی چند برسوں میں، انگریزوں کے زیر اثر معروضی حقیقت نگاری کی جانب مائل نوجوان محقق سید احمد خان نے اپنی اس مرثیہ گوئی سے برات کا اعلان کر دیا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد قوم کی حالت زار نے انہیں جذبات سے عاری حقیقت نگار کے بجائے قومی تڑپ رکھنے والا ہمہ جہت راہنما بنا دیا تھا، یوں ان بدلے ہوئے حالات میں احساس زیاں کو جگانے والی مرثیہ گوئی پھر ان کے موقف سے قریب تر ہو گئی تھی۔ اشاعت ثانی میں سرسید کا سب سے پسندیدہ حصہ اس کا وہ جدول نما باب اول ہے جس میں حکمرانوں کی پیدائش، تاجپوشی اور وفات وغیرہ سے متعلق مختصر کوائف درج کئے ہیں۔ یہ باب دراصل سرسید کے رسالے سلسلۃ الملوک کی اصلاح یافتہ صورت ہے۔ سرسید نے اس رسالے کے دیباچے میں بڑے فخر سے اسے اپنا شاہکار قرار دیا ہے۔ کلکٹر دہلی آرتھر آسٹن رابرٹس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خدا کرے کہ پسند طبع صاحب ممدوح کے ہو جن کی قدر دانی اور رئیس پروری سے یہ تالیف ہوئی" (۲۶)

سرسید نے اس جدول نما تاریخ کے سلسلے میں اپنی بے پایاں محنت کا اظہار یوں کیا ہے:

"غرضیکہ ہم نے اس تاریخ کے لکھنے میں وہ سعی اور کوشش کی ہے کہ ہماری دانست میں اس سے زیادہ صحت متصور نہیں" (27)

مقام حیرت ہے کہ اس کے محض دس بارہ برس بعد ۱۸۶۴ء میں غازی پور کے مقام پر سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کی تقریب میں تاریخ نگاری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سرسید نے اس طرح کی جدول نما تاریخوں کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا۔ فرماتے ہیں:

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ ایسی کتابوں سے جن میں صرف یہ بات لکھی ہو کہ فلاں سن میں فلاں پیدا ہوا اور فلاں سن میں مر گیا، سے انسان کے اخلاق کی درستی اور قومی تربیت ہو سکتی ہے۔ نہیں صاحبو! ہرگز نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ایک قوم کے اخلاق اور اس کی بھلائیں اور برائیاں تفصیل سے نہ بتائی جاویں" (۲۸)

مسیح نے اشاعت اول کے مقابلے میں اشاعت ثانی کی ضخامت نصف سے بھی کم کر دی تھی لیکن مندرجہ بالا اقتباس میں وہ پھر تاریخ نگاری کے حوالے سے تفصیل کو اختصار پر ترجیح دے رہے ہیں۔ یہ دراصل مغربی تاریخ کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ طامس بکل کی "ہسٹری آف سویلائیزیشن" ایسی کتابوں تک بذریعہ ترجمہ رسائی نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ معروضی حقیقت نگاری کے علاوہ تاریخ میں ایک اور رجحان بھی قابل قدر ہے۔ (۲۹)

یعنی تاریخ کی تخلیقی پیشکش، جس میں مورخ حقائق کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے، دلچسپ واقعات و روایات کی مدد سے کسی عہد کو زندہ کر کے دکھاتا ہے۔ اس طرح کا تحقیقی مورخ حسب موقع رلانے اور عبرت دلانے کا کام بھی کرتا ہے اور اس چیز کو اپنی تاریخ نگاری کی شان کے خلاف نہیں سمجھتا۔ چنانچہ سرسید جنہوں نے اشاعت اول سے مرثیہ گوئی اور مرقع نگاری کو بڑی حد تک خارج کر دیا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ پھر ان چیزوں کے قائل ہونے لگے۔ 20 جنوری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں انجمن اسلامیہ پنجاب کے استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

”آپ نے اپنے ایڈریس میں میری پچھلی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ وہ پرانی تصنیفات اس سے زیادکچھ رتبہ نہیں رکھتی تھیں جو ایک طالب علم اپنے زمانہ طالب علمی میں اپنے کچے علم اور کچی زبان میں کچھ لکھتا ہے۔ہاں !ان تصانیف میں ایک ایسی کتاب کاذکر ہے جس کی نسبت بالتخصیص کچھ کہنا چاہتاہوں۔وہ کتاب آثار الصنادید ہے ، جس میں دلی کی پرانی عمارات کا،عالی شان مکانات کاذکر ہے۔یہ وہ یادگاریں ہیں جو ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں۔جن سے ان کی شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی مگر اس زمانے میں وہ سب افسوس اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے لائق ہیں کہ ہم لوگ ایسے ناخلف ہوئے کہ ان کو قائم نہ رکھ سکے اور ان کو مٹادیا۔مجھے امید ہے کہ مسلمان اپنے بزرگوں کے ان ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کو دیکھیں گے اور روئیں گے “(۳۰)

سرسید نے اس اقتباس میں آثار الصنادید کے حوالے سے رونے رلانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ مقصد اشاعت ثانی کے مقابلے میں اشاعت اول زیادہ بہتر طور پر پورا کرتی ہے۔ اس بناء پر آخری حصہ عمر میں سرسید کا رجحان اس اشاعت کی جانب زیادہ تھا۔ان کی زندگی میں یہی اشاعت ، دیوان غالب کے ساتھ کلکتہ یونیورسٹی کے وسطانیہ کے امتحان میں ، اردو کے پرچے کے لئے شامل نصاب ہوئی۔(31)اور سرسید کی زندگی میں مطبع نولکشور کی جانب سے صرف اسی اشاعت کی طبع ثانی کا اہتمام ہوسکا۔سرسید کو اپنی تصانیف کی حفاظت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ انہوں نے آخری حصہ عمر میں دینیات اور سائنس سے متعلق اپنے وہ ابتدائی رسائل بھی جن میں پیش کردہ خیالات سے وہ اب متفق نہیں رہے ہیں ، تصانیف احمدیہ کی صورت میں محض اس خیال سے یکجا کر کے شائع کر دیئے کہ کہیں بالکل ہی ناپید نہ ہو جائیں۔(۳۲)دوسری جانب انہیں اپنی ایک زمانے کی محبوب تصنیف یعنی آثار الصنادید کی اشاعت ثانی کی حفاظت اور طبع نو کا مطلق خیال نہ آیا۔حالانکہ یہ اشاعت ایک تو نامکمل تھی کہ بغیر نشقوں کے چھپی اور دوسری جانب کمیاب بھی، کیونکہ بقول حالی اس کے بیشتر نسخے غدر میں تلف ہو چکے تھے(33)اور ۱۹۰۴ء میں منشی رحمت اللہ رعد طبع نو کے لئے بڑی مشکل سے اس کا ایک نسخہ فراہم کرپائے تھے۔(۳۴)

حوالہ جات

۱۔ سید احمد خاں، سر، آثار الصنادید کانپور ایڈیشن ۱۹۰۴ء تیسرا باب ص ۲۴، ۲۵۔
۲۔ ایضاً، نولکشور ایڈیشن ۱۸۷۶ء پہلا باب ص ۶۹۔
۳۔ ایضاً، کانپور ایڈیشن ۱۹۰۴ ، تیسرا باب ص ۴۷۔
۴۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۵۷ء ص 115۔
۵۔ سید احمد خاں، سر، آثار الصنادید، نولکشور ایڈیشن ۱۸۷۶ء پہلا باب ص ۶۹۔
۶۔ ایضا، کانپور ایڈیشن ۱۹۰۴ء ، تیسرا باب ص ۴۷۔
۷۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، اکادمی پنجاب لاہور،، ۱۹۵۷ء-04، ص ۱۱۷
۸۔ سی۔ ڈبلیو ٹرول / محمد اکرام چغتائی، مضمون بعنوان آثار الصنادید، سہ ماہی اردو، شمارہ نمبر ۱۹۷۵۲ء، انجمن ترقی اردو کراچی ص ۱۹۵ تا ۱۹۷۔
۹۔ سید احمد خاں، سر، سلسلۃ الملوک، خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۹ء ، ص ۹۔
۱۰۔ سی۔ ڈبلیو ٹرول / محمد اکرام چغتائی، مضمون بعنوان آثار الصنادید، سہ ماہی اردو، شمارہ نمبر ۱۹۷۵۲ء، انجمن ترقی اردو کراچی ص ۲۹۱۔
۱۱۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۵۷ء ص ۱۱۷۔
۱۲۔ خلیق انجم، ترتیب و تعارف اور حواشی، آثار الصنادید جلد اول، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء ص ۱۶۴۔
۱۳۔ سی۔ ڈبلیو ٹرول / محمد اکرام چغتائی، مضمون بعنوان آثار الصنادید، سہ ماہی اردو، انجمن ترقی اردو کراچی، شمارہ ۱۹۷۵۲ء ص ۲۰۴۔

AL-AASAR Journal Vol. 2, No. 4 (2025)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com
Print ISSN:3006-6921

۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ خلیق انجم، ترتیب و تعارف اور حواشی، آثار الصنادید جلد اول، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء ص ۱۶۲
۱۶۔ سید احمد خاں، سر، آثار الصنادید نولکشور ایڈیشن ۱۸۷۶ء، پہلا باب ص ۱۱ تا ۱۴۔
۱۷۔ ایضاً، کانپور ایڈیشن، تیسرا باب ص ۲۹۔
۱۸۔ زکریا، خواجہ محمد، ڈاکٹر، چوتھا باب، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، آٹھویں جلد، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء ص ۱۱۶۔
۱۹۔ سید احمد خاں، سر، آثار الصنادید، نولکشور ایڈیشن ۱۸۶۲ء، پہلا باب ص ۴۵۔
۲۰۔ ایضاً
۲۱۔ ایضاً، کانپور ایڈیشن، ۱۹۰۴ء تیسرا باب ص ۵۱۔
۲۲۔ ایضاً، نولکشور ایڈیشن ۱۸۷۶ء، پہلا باب ص ۵۴۔
۲۳۔ ایضا، کانپور ایڈیشن ۱۹۰۴ء، تیسرا باب ص ۱۵۔
۲۴۔ ایضاً، نولکشور ایڈیشن ۱۸۷۶، پہلا باب ص ۵۳۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۵۰۔۵۱
۲۶۔ ایضا، کانپور ایڈیشن ۱۹۰۴ء، تیسرا باب ص ۳۴۔
۲۷۔ سید احمد خاں، سر، سلسلۃ الملوک، خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور ۱۹۰۹ء، ص ۴۴۔
۲۸۔ ایضاً، ص ۹۔
۲۹۔ سید احمد خاں، سر، خطبات سرسید جلد اول مرتبہ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۸۵
۳۰۔ اسماعیل پانی پتی، ترتیب و تدوین، مقالات سرسید حصہ ششم، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۲ء لاہور ص ۱
۳۱۔ خطبات سرسید جلد اول ص ۴۹۰، ۴۹۱۔
۳۲۔ اسماعیل پانی پتی، ترتیب و تدوین، مقالات سرسید، جلد شانزدہم، مجلس ترقی اردو
۳۳۔ حالی، حیات جاوید، ص ۱۱۷۔
۳۴۔ رعد، منشی رحمت اللہ، ترتیب و تعارف آثار الصنادید، کانپور ایڈیشن ۱۹۰۴ء، ص ۲۔